کرشن چندر کا افسانہ "کچرا بابا" کے منفی کردار

محمد سلیمان پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو جامعہ پشاور

ڈاکٹر بادشاہ منیر بخاری، شعبہ اردو جامعہ پشاور

Abstract:

If there is a name is a progressive shot story writer who achieved brilliance and fame after Prem Chand it was not other than Krishan Chandar. One can quench his thirst for subject; krishan chandar has dealt with, in his stories. Adding to this he is knowledgeable about and has a considerable command on the themes he chooses. There would barely be any aspect of life that would have been slipped away from his observations and experiences. There are various subjects scattered in his stories like starvation, poverty, sexuality, psychology, love and beauty, class conflict of the individuals of the lover, upper and middle classes, social and economic crisis, politics, religion and sectarianism.

کلیدی الفاظ: کرشن چندر، افسانہ، کردار، احساسات، جذبات،

اردو افسانے میں ۱۹۳۶ء کے بعد قلم کاروں کی جو نئی نسل پروان چڑھی اس میں کرشن چندر کو جو تقویت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ پریم چند کے بعد کسی اور افسانہ نگار کے حصے میں نہیں آئی۔ کرشن چندر کے ابتدائی دور کے افسانے رومانی جذبات واحساسات سے لبریز ہیں۔ آغاز میں انہوں نے فطرت کے حسن اور محبت کے کومل جذبوں کے راگ الاپے۔ کشمیر کی حسین وادیوں، سرسبز باغات اور پھولوں، پھلوں کے پس منظر میں محبتوں کے گن گائے۔ ان کے اس دور کی کہانیاں محبت ورومانیت کے غلبے کے باوجود عصری تقاضوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ بعد میں جب ترقی پسندیت کی جانب مائل ہوئے تو سماج کی تلخ وکڑوی حقیقتوں کی تصویروں پر زور دینے لگے اور سماج کے پسے ہوئے مظلوم طبقے کی حمایت، سامراجی قوتوں کی مخالفت اور سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کے غاصبانہ رویوں اور مظالم کو اپنے افسانوں میں زور وشور سے بیان کرنے لگے۔ ڈاکٹر احمد حسن کے بقول؛

> "ان کے افسانوں مین فطرت کے حسن اور رومانیت کے علاوہ اپنے عہد کے اقتصادی، معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان کے افسانوں کے کرداروں

میں مزدور، کسان، سیٹھ، زمیندار، کلرک، رکشہ ڈرائیور، اور عام زندگی کے دوسرے افراد شامل ہیں۔"(۱)

کرشن چندر کے ہاں موضوعات کا ایک سمندر رہے۔اس پر مستزاد یہ کہ وہ ہر ایک موضوع سے مکمل جانکاری اور پورا دسترس رکھتے ہیں۔ڈاکٹر اقبال آفاقی کی نظر میں؛

"وہ جس موضوع کو بھی مس کرتا ہے اسے ایک دلکش کہانی میں تبدیل کر دیتا ہے۔اس کے موضوعات اتنے زیادہ ہے جیسے آسمان پر ستارے وہ ہر موضوع کے بھیتر میں سے کوئی نہ کوئی ستارہ تلاش کر کے اسے کہانی میں ڈھال لیتا ہے۔اس کی خوبصورت نثر،اس کا رومانی اسلوب، زندگی پر اس کی طنزیہ اور استہزایہ نظر، زہر خند کا استعمال، اس کا کہانیوں کا یوٹوپیائی لینڈ اسکیپ، اس کی ترقی پسند سوچ، زندگی کے تضادات کا گہرا احساس اور تضاد کو ابھارنے کی تکنیک پر مکمل عبور۔۔۔لیکن بایں ہمہ میرے نزدیک اس کی بے پناہ کشش کا اصل سبب اس کی جمالیات کے ساتھ ساتھ سماجی حقیقتوں میں گہرا دسترس ہے۔تاہم وہ روکھی پھیکی اور بدمزہ حقیقت نگاری کے قائل ہر گز نہیں۔اس کی حقیقت نگاری میں کھلے نیلے آسمان کی سی وسعت ہے۔(۲)"

زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا اہم پہلو رہا ہو جو ان کے مشاہدہ اور تجزیے کی زد میں نہ آیا ہو۔بھوک، افلاس، جنس و نفسیات، حسن و عشق، ادنیٰ و اعلیٰ اور متوسط طبقے کے افراد کی طبقاتی کشمکش، اقتصادی بحران، سماجی بحران، ہر پیشے کے لوگ، سیاست اور مذہبی و سماجی فرقہ واریت غرض ہر نوع کے مسائل ان کی کہانیوں میں بکھری پڑے ہیں۔

مارکسی نظریہ سے تاثر لینے کے بعد ان کے افسانوں میں سرمایہ داری جبر سے چھٹکارا پانے کی آرزو، طبقاتی استحصال کے خلاف غور و فکر اور غم و غصہ و احتجاج جیسے جذبات نمایاں ہوئے۔جیلانی بانو رقم طراز ہیں؛

"کرشن چندر کا نقطہ نظر مارکسزم سے عبارت تھا۔اس کے توسط سے انہوں نے انسانی معاشرے کی تاریخ اور آس پاس کی زندگی، افراد اور معاشرے کے باہمی رشتوں کا تجزیہ کیا اور انہیں اپنے فن کا موضوع بنایا۔(۳)"

انہوں نے اپنی کہانیوں میں انسانی زندگی کے دکھ انسان اپنے ہم جنس پر ظلم وزیادتی اور سماجی ومعاشی ناہمواریوں سے پھوٹنے والے نفسیاتی رویوں کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے صرف معاشرے کے فرد کی لامتناہی محرومیاں بیان نہیں کیں بلکہ ان محرومیوں کے پس پردہ لاشعوری اور نفسیاتی ہیجانات کو بھی ملحوظ رکھا اور اس ذہنی ونفسیاتی خلفشار سے جنم لینے والے انتشار اور بگاڑ کو کہیں پوشیدہ کہیں علامتی پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ ان کے کثیر تعداد میں ایسے افسانے ہیں جن میں فرد کی محرومیوں اور مجبوریوں کو ذہنی ونفسیاتی حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کوئی اپنے لاشعوری محرکات کی زد میں آچکا ہے تو کوئی احساس کمتری و برتری کے الجھاؤ میں بکھرا پڑا ہے اور کوئی ذہنی ونفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو کر زندگی کے لطف سے محروم ہو چلا ہے غرض گوناگوں نفسیاتی ومنفی کردار ان کے افسانوں میں جابجا موجود ہیں۔ ایسا ہی ان کا ایک افسانہ "کچرا بابا" ہے۔ جس میں ایک طرف معاشی وسماجی مجبوریاں ہیں تو دوسری طرف ہندوؤں کے قدیم مذہبی رسوم وروایات ہیں اور ان رسموں سے جنم لینے والے محرومیوں سے بچاؤ کے افعال ہیں۔ مذکورہ افسانہ میں ایک کردار جس کا بعد میں "کچرا بابا" نام پڑ جاتا ہے ہسپتال سے ڈسچارج ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس کی صحت ابھی مکمل طور پر بحال نہیں ہوئی لیکن پیسوں کی عدم دستیابی کی بدولت ہسپتال انتظامیہ اسے دارالشفا پر بوجھ سمجھ کر نکال دیتی ہے

۔

کچرا بابا کی بیوی دلاری نے ایک ہندوستانی عورت کے تمام فرائض ادا کرتے ہوئے اس کی حد درجہ دیکھ بھال کی۔ ساڑھے چار ماہ تک اسے پرائیوٹ وارڈ میں رکھا جب معاش میں تھوڑی کمی آئی تو اسے ڈیڑھ ماہ تک جنرل وارڈ میں رکھا، گردے کے پہلے آپریشن پر بیوی نے اپنے گہنے بیچ ڈالے۔ دوسرے آپریشن کے مالی اخراجات پورے کرنے کے لیے دلاری کو کڑی محنت ومشقت کرنا پڑی جس سے اس کے پیٹ میں پلنے والا بچہ دنیا میں آنکھیں کھولنے سے قبل ہی اگلی دنیا میں منتقل ہو گیا؛

> "ناسازگار ماحول دیکھ کر اور ماں باپ کی پتلی حالت بھانپ کر اس نے خود ہی پیدا ہونا مناسب نہیں سمجھا بعض بچے ایسے ہی عقل مند ہوتے ہیں۔(۴)"

گردے کے دوسرے آپریشن کے بعد اس کی ملازمت بھی چلی گئی لیکن دلاری نے ہمت نہیں ہاری۔ تنکا تنکا اکھٹا کیا یہاں تک کہ گھر کی تمام چیزیں بیچ ڈالیں۔ اس بات سے بھی بات نہ بنی تو کسی فرم میں ملازمت اختیار کر لی۔ ایک دن اپنے فرم کے مالک کو اپنے شوہر سے ملوانے کے لیے ہسپتال بھی لے آئی۔ شوہر سے ملنے کے بعد جب وہ واپس جانے لگی تو؛

"اس نے محسوس کیا کہ آج دلاری کے قدموں کی چاپ میں ایک عجیب خود اعتمادی سی ہے اس کا جسم کسی پھولدار شاخ کی طرح لچک رہا ہے۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے باس نے دلاری کے لیے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا اور پھر مؤدب ہو کر دروازے سے باہر جانے کی دعوت دیتے ہوئے ذرا سا جھکا اور ایک لمحے کے لیے اس کا دوسرا ہاتھ کمر پر ایک ثانیے کے لیے۔۔۔ اس کا تیسرا آپریشن ہسپتال کے جنرل وارڈ میں ہوا اس وقت تک دلاری فرم کے منیجر کے ساتھ دار جلنگ جا چکی تھی۔(۵)"

شوہر کے علاج کے لیے وہ جتنے جتن کر سکتی تھی وہ کرتی رہی لیکن آخر میں جب اسے کوئی امید دور تک نظر نہ آئی تو شوہر کو شدید علالت میں چھوڑ کر آشنا کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ معاشرتی طور پر دیکھا جائے تو دلاری ایک منفی کردار ہے اسے اپنے شوہر کو بیچ دلدل میں نہیں چھوڑنا چاہیے تھا ہر حالت میں اس کا ساتھ دینا چاہیے تھا لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے تصویر کی دوسری طرف نگاہ ڈالی جائے تو دلاری کی کچھ خواہشات ہیں کچھ حسرتیں ہیں جو شوہر کی وساطت سے پوری ہوتی ہیں۔ پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ عورت شادی کیوں کرتی ہے؟ ڈاکٹر عصمت جمیل کی زبانی؛

"شادی کے بے شمار فوائد ہیں ایک تو یہ کہ معاشرہ اس انارکی سے بچ جاتا ہے جو عورت آزاد جنسی کردار کی بنا پر معاشرے میں برپا کر سکتی ہے، دوسرے عورت خود کما کر کھانے کی ذمہ داری سے بچ جاتی ہے اسے بے شمار مردوں کی نظروں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو اس کے کام پر کم اور اس پر زیادہ نظر رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شوہر کا گھر اسے موت تک تحفظ دیتا ہے۔ طوائف اور شادی شدہ عورت میں یہی فرق ہے کہ طوائف زیادہ کمانے کے باوجود معاشرے میں اعتبار نہیں پاتی۔(۶)"

علاوہ ازیں شادی کے بعد عورت اپنے مستقبل سے مطمئن ہو جاتی ہے۔ اسے زمانے کی نظروں میں تحفظ حاصل ہو جاتا ہے۔ شوہر سے ملنے والی محبت اسے کسی حد تک مکمل کر دیتی ہے۔ اس کی ضرورتوں اور خواہشات کی پاسداری پر عمل ہونا شروع ہو جاتا ہے شادی ہی سے بچوں کی پیدائش اور پرورش کے ذریعے اپنی مادرانہ جبلت کو تسکین پہنچانے کا موقع ملتا ہے بلکہ شادی ہی کے ذریعے سے مستقبل کی طرف طمانیت اور امید حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ جب شباب کی رعنائی اور حسن کی دلکشی ماند پڑ جائے اور پیرانہ سالی کا دور شروع ہو گا اس وقت بھی اسے شوہر کی محبت اور قربت کا سہارا حاصل رہے گا۔

شادی کا موضوع بڑا وسیع ہے اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا ناممکن ہے لیکن اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ شادی تمام مسائل کا مشترکہ مقابلہ کرنا اور باہمی محبت کے ساتھ زندگی کی تعمیر میں حصہ لینے کا نام ہے۔

دلاری کی شادی کو دو سال ہو چکے ہیں ان میں چھ ساتھ ماہ تو ہسپتال اور گھر کے مابین چکر کاٹتے ہوئے گزر گئے۔ محبت کی ایک نشانی جو اس کے پیٹ میں پل رہی تھی وہ زیادہ محنت اور کام کی نذر ہو گئی۔ اپنے زیورات اور گھر کا تمام ساز و سامان بیچ کر زندگی کی بنیادی آسائشوں سے بھی محروم ہو گئی اور اس پر مستزاد یہ کہ شوہر صحت مند ہونے کی بجائے روز بروز موت کے قریب ہوتا جا رہا ہے شادی کے بعد اس کی لاشعوری خواہشات کو زندگی کے بے رحم تھپیڑوں نے اپنی گرفت میں لے لیا شوہر کی مستقل بیماری نے اس کی تشنہ آرزوؤں کو سیراب نہ ہونے دیا شوہر کی طرف اسے نہ وہ محبت ملی جس کی وہ حق دار تھی نہ اسے زمانے کی نظروں سے تحفظ ملا اور نہ کمانے کے جھنجھٹ سے رہائی ملی شادی کے بعد دلاری کی زندگی میں محبت کی بو، پیٹ کی بھوک اور شوہر کے حوالے سے شناخت کی بھوک نمایاں رہی۔ وہ اکیلی جان سے کب تک زندگی کی ان ناگزیر ، بکھیڑوں کو سنبھالتی اور پھر ایک عورت ہونے کے ناطے کب تک معاشرے کی ہوس بھری نگاہوں کی تاب لاتی۔

ایڈلر کا خیال ہے کہ جب تک ایک فریق اپنی ذات سے زیادہ دوسرے میں دلچسپی کا اظہار نہیں کرتا اس وقت شادی کامیاب نہیں ہو سکتی اس کے خیال میں تکمیل محبت کے بعد صنف مخالف کے ایک فرد کو دوسرے کے لیے بے انتہا خود سپردگی کا نام شادی ہے جس کا اظہار یگانت اور اولاد کی صورت میں ہوتا ہے۔

تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ شادی ایک ایسا معاہدہ جس میں دونوں فریق ہاتھ میں ہاتھ اور قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھتے ہیں لیکن یہاں تو صرف دلاری ہی ایک ہاتھ سے تالی بجانے کی بے سود کوشش کر رہی ہے۔

دلاری کا اپنے شوہر کو عین بیماری کی حالت میں چھوڑ کر چلے جانے میں کچھ نفسیاتی اور لاشعوری محرکات بھی پوشیدہ ہیں۔ ہندوؤں مذہبی روایات میں شوہر کے مرنے کے بعد بیوی دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر جمیل کے مطابق؛

> "وسطی دور میں ستی کی رسم عام تھی کیونکہ بیوہ عورت کے پاس سوائے جل مرنے کے کوئی دوسرا رستہ موجود نہ ہوتا۔ شوہر کے بعد اس کی زندگی جہنم سے کم نہ ہوتی تھی دوسری شادی کی اجازت نہ تھی۔ مذہبی رسومات میں شرکت نہ کر سکتی تھی۔ شادی بیاہ کی رسومات میں اسس کی شرکت کو نحوست سمجھا جاتا تھا۔ ان کا سر مونڈ دیا جاتا، چوڑیاں توڑ دی جاتیں۔ انھیں صاف ستھرا کپڑا پہنے اور صاف بستر پر سونے تک کی اجازت نہ تھی۔ غرض ان کی سماجی زندگی شودروں سے بدتر ہو جاتی ہے۔(۷)"

اگرچہ ستی کی رسم تو انگریزوں کے آنے کے بعد ختم ہو گئی تھی لیکن بعض رسمیں آج بھی موجود ہیں۔ خصوصاً شوہر کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہ کرنے کی رسم آج بھی جوں کی توں موجود ہے۔ اس رسم کے خلاف ہندوستان میں ملکی و قومی سطح پر کئی تحریکیں بھی اٹھیں، میڈیا اور ذرائع ابلاغ پر بھی اس مسئلے کو اچھالا گیا لیکن یہ ہنوز حل طلب ہے۔

دلاری کو شعوری و لاشعوری طور پر ان رسم و روایت سے آگاہی حاصل تھی۔ اسے علم تھا کہ شوہر کے مرنے کے بعد اسے ان تمام اذیتوں اور سماجی کج روی کا سامنا کرنا پڑے گا اور ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی، صرف بیس سال وہ اپنی جوانی کو ان فرسودہ روایتوں کی نذر نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے شوہر کے مرنے سے قبل ہی بغاوت کے راستے دوسرے شوہر کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے تاکہ ہر دم مرنے کے بجائے مسرتوں اور خوشیوں بھری زندگی ملے۔

ہندو دھرم میں مرد اور عورت کے حقوق کے لحاظ سے بڑا تضاد پایا جاتا ہے۔ بیوی کے مرنے کے بعد شوہر کو دوسری شادی کو دوسری شادی کرنے کا حق حاصل ہے جب کہ شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کو دوسری شادی کی اجازت

نہیں، بلکہ اس کی زندگی میں کئی سماجی کوفتوں کا مزید اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کی چوڑیاں توڑ دی جاتی ہیں، ماتھے کا سیندور مٹا دیا جاتا ہے سفید کپڑے پہنا کر گھر کے کسی کونے میں رکھ دی جاتی ہے۔

دلاری سے جہاں تک بن سکتا تھا سب کچھ کر لیا۔ شوہر کو ساڑھے چار ماہ تک پرائیوٹ وارڈ میں رکھا پھر یکے بعد دیگرے عمل جراحیوں پر پہلے اپنے زیورات (جو ہر عورت کی بڑی قیمتی متاع ہوتی ہے) پھر گھر کا ساز و سامان اور گھر کی تمام جمع پونجی صرف کر ڈالی، اس الے تللے میں شوہر کی زندگی بچانے کے لیے ہزار جتن کیے پھر بھی بات نہ بنی تو اسے اپنا مستقبل مخدوش نظر آنے لگتا ہے؛

> "قوتِ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے، اور بیس برس کی لڑکی کی قوت برداشت بھی کیا؟ جس کی شادی کو ابھی دو سال بھی نہ ہوئے تھے اور جس نے اپنے شوہر کے ساتھ مصیبتوں کے سوا اور کچھ بھی نہ دیکھا۔ (۸)

دلاری کی یہ بغاوت اور اخلاق سوز قدم بظاہر تو منفی عمل نظر آ رہا ہے لیکن در حقیقت اس کے پس پشت لاشعوری محرکات کا عمل دخل زیادہ ہے جس نے اسے یہ انتہائی قدم لینے پر مجبور کیا۔ وہ اس زندگی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی جس کے گرداب میں پھنس کر اپنی آزادی، خوشیاں اور فطری زندگی کا حق کھو دے۔

یہ کہاں کا انصاف ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد بیوی پر اور خوشیوں کے در بند کر دیئے جائیں۔ اسے رسمی و روایتی قیود کے پنجرے میں ڈال دیا جائے۔ بس فقط سفید لباس ہی اس کی پوری متاع قرار دی جائے۔ انہی غلط رسموں سے اس نوع کے دلخراش واقعات اور اخلاق سوز برائیاں جنم لیتی ہیں۔

دوسری طرف کہانی میں دلاری کے شوہر کو دیکھا جائے تو ہسپتال سے نکلتے وقت کوئی گھر نہیں بیوی نہیں، بچے نہیں، نوکری نہیں، دل اور جیب خالی، محض اس کے سامنے ایک خالی سپاٹ مستقبل تھا۔ انتہائی کسمپرسی اور مایوسی کی حالت میں اسپتال سے نکل آتا ہے تو ناتوانی اور نقاہت کی وجہ سے زمین پہ رینگتے رینگتے اور گھسٹتے گھسٹتے کچرے کے ڈھیر تک پہنچ جاتا ہے۔ بھوک ستانے لگتی ہے تو کچرے کے ٹب کو کھنگالنا شروع کر لیتا ہے؛

"اس کے کانپتے ہوئے بے قرار ہاتھوں نے کیلے کے اس پتل کو دبوچ لیا اور وہ اک وحشیانہ گرسنگی سے مغلوب ہو کر ان پوریوں پر ٹوٹ پڑا۔ پوری بھاجی کھا کے اس نے کیلے کے پتے کو بار ہا چاٹا اور اسے ایسا شفاف کر کے چھوڑ دیا جیسے قدرت نے اسے بنایا تھا۔ پتل چاٹنے کے بعد اس نے اپنی انگلیاں چاٹیں اور لمبے لمبے ناخنوں میں بھری ہوئی آلو کی بھاجی زبان کی نوک سے نکال کر کھائی اور جب اس سے بھی اسے تسلی نہ ہوئی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر کوڑے کے ڈھیر کو گھنگھولتے ہوئے اس میں پودینے کے پتے نکال کر کھائے اور مولی کے دو ٹکڑے اور آدھا ٹماٹر اپنے منہ میں ڈال کر مزے سے اس کا رس پیا اور جب وہ سب کھا چکا تو اس کے سارے جسم میں نیم گرم غنودگی کی ایک لہر سی اٹھی اور وہ وہیں ٹب کے کنارے گر کر سو گیا۔(۹)"

کچھ دنوں بعد جسم میں طاقت آنے لگی۔ یہ ٹب اس کی روزی کا وسیلہ اس کے شب و روز کا رازق تھا۔ کام کاج، زندگی، سماج اور جدوجہد اس کے لیے بے معنی ہو گئے تھے۔ یہی کچرے کا ڈھیر اس کا اوڑھنا بچھونا اور زندگی بن گئی تھی۔ اس علاقے کے تمام لوگ اسے "کچرا بابا" کہہ کر پکارنے لگے۔ لوگوں کو اگر اسے کچھ دینا ہو تو خوراک کی چیزیں اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے اسی ٹب میں پھینک دیتے۔ گرض ناؤنوش کی ہر نعمت اسے اس ٹب سے مل جاتی تھی۔ درحقیقت اس کردار نے تارک الدنیا ہو کر راہبی اختیار کر لی تھی۔ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے۔ یہ معاشرے کے افراد کے ساتھ مل کر باہم زندگی گزارتا ہے ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشیوں میں شریک ہوتا ہے۔ کچرا بابا کو مصیبت کے وقت نہ صرف اپنی بیوی سے بے وفائی ملی بلکہ ناگفتہ بہ حالت میں سماج نے بھی اس کے دکھوں کا مداوا نہیں کیا۔ یہ زندگی کے لطائف اور محبتوں کے رشتوں پر سے اس کا اعتماد نیست ہو چکا تھا۔ وہ زندگی اور پیار و محبت کے لفظوں سے شعوری طور پر کنارہ کش ہو چکا تھا۔ اس کے سارے جذبات و احساسات مردہ پڑ چکے تھے۔ نہ بیوی ہے نہ بچہ ہے نہ نوکری ہے اور نہ معاشرہ اس کے زخموں پر مرہم رکھ رہا ہے کچرے کا ٹب ہی اس کی پوری دنیا بن چکی ہے۔ اسی ٹب کے کنارے اس نے زندگی کے پچیس سال بسر کئے۔

پھر ایک رات ایک عجیب سانحہ پیش آیا۔ رات کے سناٹے میں ایک خوفناک چیخ سن لیتا ہے پھر جب چیخیں مسلسل ہو گئیں تو ان چیخوں کے تعاقب میں کچرے کے ٹب کی طرف بڑھتا ہے؛

"کچرے کے ٹب کے پاس جا کر اس نے ٹٹولا، تو اس کا ہاتھ کسی نرم نرم لوتھڑے سے جا ٹکرایا اور پھر ایک زور کی چیخ بلند ہوئی۔ کچرا بابا نے دیکھا کہ ٹب کے اندر ڈبل روٹی کے ٹکڑوں، چچوڑی ہوئی ہڈیوں، پرانے جوتوں، کانچ کے ٹکڑوں، آم کے چھلکوں، باسی وینیوں اور ٹھرے کی ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے درمیان ایک نوزائیدہ بچہ ننگا پڑا ہے اور اپنے ہاتھ پاؤں ہلا ہلا کر زور زور سے چیخ رہا ہے۔(۱۰)"

بچے کرانے کے لیے ٹب سے آم کی ایک گھٹلی نکال کر اس کا سرا بچے کے منہ میں دیتا ہے۔ آم کا میٹھا رس حلق میں اترتے ہی بچہ روتے روتے چپ ہو جاتا ہے۔ تب اس کے ذہن میں ایک خیال آیا؛

"ایک لمحہ کے لیے کچرا بابا کے دل میں خیال آیا کہ وہ بچے کو یہیں پھینک کر کہیں بھاگ جائے دھیرے سے کچرا بابا نے اس بچے کے ہاتھ سے اپنے انگوٹھے کو چھڑانے کی کوشش کی مگر بچے کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ کچرا بابا کو ایسے محسوس ہوا جیسے زندگی نے اسے پھر پکڑ لیا ہے۔(۱۱)"

رات بھر وہ اس بچے کو کولہے میں لے کر پیار دیتا رہا اور اس کی نگہداشت کرتا رہا۔ صبح ہوئی تو کچرا بابا نئی صبح کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے؛

"سڑک کے پار نئی تعمیر ہونے والی عمارت کے نیچے کھڑا ہو کر اینٹیں ڈھو رہا ہے اور اس عمارت کے قریب گل مہر کے ایک پیڑ کی چھاؤں میں ایک پھولدار کپڑے میں لپٹا ہوا ننھا بچہ منہ میں دودھ کی چوسنی لیے مسکرا رہا ہے۔(۱۳)"

اس کردار کے حوالے پہلی بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ یہ کچرے کے ڈھیر کو اپنی جائے مسکن کیوں چنتا ہے پھر کچھ عرصے بعد اس کی صحت بحال ہو جاتی ہے تب وہ اس ٹب کو چھوڑ کر نئی زندگی کیوں شروع نہیں کر رہا ہے۔

حقیقت میں یہ کرادر گھر بار کے لٹنے اور خصوصاً بیوی کی بے وفائی کے بعد زندگی سے مایوس ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اسے دل وجان سے چاہتا تھا لیکن جب اسی بیوی نے بے وفائی کر کے اسے ناگفتہ بہ حالت میں چھوڑ دیا تو اس کا رشتوں پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اسی عدم اعتماد نے اسے زندگی سے کوسوں دور کر دیا۔ اسی نے اس کے باطن کی ساری روشنیاں چھین لیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ کچرا بابا اپنے لاشعور میں ہندوستانی بیوی کا تصور رکھتا تھا۔ اس تصور کے تحت بیوی ہر حالت میں شوہر کی خدمت کرتی ہے اسے کھلاتی پلاتی ہے۔ زیادہ تھکاوٹ کی صورت میں اس کے پیروں کی مالش کرتی ہے۔ شوہر کی پرستش دیوتا کی حد تک کرتی ہے۔ شوہر کے جاگنے سے پہلے جاگنا اور اس کے کھانے کے بعد کھانا اس کی فطرت ہوتی ہے۔ اسے شوہر کے ساتھ ہر حالت میں خوش رہنا چاہیے، اپنے خانگی فرائض میں اسے ماہر ہونا چاہیے۔ دکھ درد میں ساتھ دینا چاہیے۔ شوہر سے بے وفائی کرنے سے یکسر نابلد ہونا چاہیے وغیرہ۔

ان تمام امور کو لاشعور میں رکھتے ہوئے وہ بھلا بیوی کی بغاوت کو کس طرح سہہ سکتا تھا اس لیے تو اس کا واسطہ زندگی اور اس کی رعنائیوں سے منقطع ہو جاتا ہے۔ زندگی سے لگاؤ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ پچیس سال کچرے کے ڈھیر پر گزارنا خودکشی سے دوگنی اذیت اوور نحوست بھر زندگی تھی۔

پھر جب گندگی کے ڈھیر میں اسے نوزائیدہ بچہ ملتا ہے اسے گود میں لیتے ہی دلاری اور اپنا پہلا بچہ یاد آنے لگتا ہے اور ساتھ ہی دل میں پھر سے زندگی کی برقی رو دوڑنے لگتی ہے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دلاری کو وہ بھولا نہیں تھا بلکہ اس کی بے وفائی کا خود سے انتقام لے رہا تھا اوشو رقمطراز ہے؛

> "لوگ اپنی حماقت میں سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر یہ شخص میرے ہاتھ سے نکل گیا تو میں ساری زندگی محبت سے محروم رہوں گا۔ وہ نہیں جانتا کہ اس شخص کو مستقل طور پر اپنی گرفت میں رکھنے کی کوشش کر کے وہ محبت سے محروم رہے گا۔ وہ محبت حاصل نہیں کرے گا۔ تم کسی

غلام سے محبت حاصل نہیں کر سکتے ۔ تم اپنی ملکیتی شے سے محبت حاصل نہیں کر سکتے ہو۔
(۱۳)"

ہندو دھرم میں شوہر کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے وہ اس کے ساتھ ہر روا ناروا اور جائز و ناجائز سلوک کرتا رہتا ہے لیکن مرد یہ بھول جاتا ہے کہ اس کی ملکیت کا تحفظ بھی تو اس کی ذمہ داری ہے۔ زندگی کی تمام بنیادی ضروریات پوری کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے ملکیت (بیوی) پر حق تو جتاتا ہے لیکن اسے اس کے حقوق سے پرے رکھتا ہے

کچرا بابا کو جب بچہ ملتا ہے تو اس میں پھر سے زندگی کی رمق پیدا ہو جاتی ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شخص محبت اور انس کا بھوکا ہے۔ بیوی نے اسے ترک کر دیا تھا، معاشرے نے دھتکارا تھا۔ بیماری نے خود ذہنی طور پر اسے نفسیاتی الجھنوں میں ڈالا تھا۔ بچے کی وساطت سے محبت کا لمس چھوتے ہی زندگی کی طرف لوٹ جاتا ہے اور ایک نئ زندگی کی شروعات پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ بچہ کی دریافت سے پہلے اس کی زندگی کا کوئی مدعا ہی نہ تھا نہ گھر بار نہ بیوی نہ بچہ نہ نوکری اور اس پر طرہ یہ کہ سماج نے بھی انسانوں کی فہرست سے نکال باہر کیا تھا۔ اب بچہ کے آنے کے ساتھ اس کی زندگی پھر سے بھر گئی پھر سے اس میں امیدوں کی شمعیں روشن ہوئیں۔ اس تجزیے سے ثابت ہوتا ہے کہ ضروری نہیں کہا انسانی شخصیت مین پروان چڑھنے والے منفی رویے ہمیشہ کے لیے موجود رہے بلکہ وقت اور بہتر ماحول ملنے کے بعد ان منفی رویوں کی بیخ کنی ممکن ہو جاتی ہے۔

اس افسانے کے دونوں کردار کچرا بابا اور دلاری ہندوؤں کے بے جا رسوم و روایات کے ہاتھوں سسک رہے ہیں۔ یہی روایات دلاری کو بغاوت پر آمادہ کرتے ہیں تو اس کے شوہر کو کچرے کے ڈھیر پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر احمد حسن، کرشن چندر اور افسانہ نگاری، فکشن ہاؤس لاہور، ۱۹۹۲ء ص ۱۴۲

۲۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی، اردو افسانہ فن ہنر اور متنی تجزیے، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۱۰۳ تا ۱۰۴

۳۔ جیلانی بانو، کرشن چندر، ساہتیہ اکادمی دہلی، ۱۹۹۲ء ص ۲۱

۴۔ کرشن چندر/ترتیب وانتخاب ظاہر منصور فاروقی، کرشن چندر کے بے مثال افسانے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۴۷

۵۔ ایضاً، ص ۴۸، ۴۹

۶۔ ڈاکٹر عفت جمیل، نسائی شعور کی تاریخ، اردو افسانہ اور عورت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء ص ۴۷

۷۔ ڈاکٹر عفت جمیل، نسائی شعور کی تاریخ، اردو افسانہ اور عورت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء ص ۳۸

۸۔ کرشن چندر/ترتیب وانتخاب ظاہر منصور فاروقی، کرشن چندر کے بے مثال افسانے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور ،۲۰۰۸ء ص ۴۹

۹۔ ایضاً، ۵۳، ۵۲

۱۰۔ ایضاً، ۵۶

۱۱۔ ایضاً، ۵۷

۱۲۔ کرشن چندر/ترتیب وانتخاب ظاہر منصور فاروقی، کرشن چندر کے بے مثال افسانے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور ،۲۰۰۸ء ص ۵۷

۱۳۔ اوشو/مترجم محمد احسن بٹ، عورت، نگارشات پبلی شرز لاہور، ۲۰۱۷ء ص ۱۷۸